© rasailojaraid.com

ترجمۂ قرآن - مسائل و مشکلات

محمد فاروق خان

کسی زبان کے متن یا عبارت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہوتا، ہر زبان کی کچھ اپنی ذاتی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر زبان کا اپنا دروبست، اس کے الفاظ کا اپنا صوتی حسن و آہنگ اور ان کا اپنا روایتی پس منظر ہوتا ہے۔ بعض الفاظ کے معنی میں کبھی کبھی اتنی وسعت اور گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے کہ ان کا متبادل دوسری زبان میں تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ پھر ہر زبان کے کچھ اپنے محاورے، روزمرہ، ضرب الامثال، اور اسالیب ہوتے ہیں ان ساری چیزوں کا ترجمہ میں پاس ولحاظ رکھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے مقدمہ ترجمہ قرآن میں ترجمے کے اقسام اور ان کے نقائص و معائب اور قرآن کے ترجمہ کی مشکلات تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ترجمہ کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے کسی نے کہا ہے کہ ترجمہ درحقیقت دو زبانوں کے درمیان محض ایک طرح کا سمجھوتا یا مصالحت ہے اور مصالحت میں بالعموم کچھ نہ کچھ نقصان گوارا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھیں۔ تین جملے ہیں:

لڑکا گرا   لڑکا گر گیا   لڑکا گر پڑا

ان تینوں جملوں میں جو باریک فرق پایا جاتا ہے ضروری نہیں کہ اس فرق کو دوسری زبان میں ہم ملحوظ رکھ سکیں۔ اس لیے کہ یہ لازمی نہیں کہ دوسری زبان میں بھی افعال کے اس طرح کے معاون افعال موجود ہوں۔ اسی لیے رابرٹ فراسٹ (۱۹۵۵ء) کو کہنا پڑا کہ ترجمہ ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی ہے۔ ترجمہ میں تخلیق کو ازسرنو پانا ہوتا ہے۔ اسی لیے امریکہ میں ترجمہ کو Recreation یعنی باز تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں۔ کامیاب ترجمہ تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہی ہوگا جس میں کسی زبان کے متن کی جگہ دوسری زبان کا ایسا متبادل پیش کیا گیا ہو جس میں مفہوم و معنی کے ساتھ ساتھ اسلوب اور انداز بیان کی بھی رعایت پائی جاتی ہو۔ ترجمہ میں اصل متن کے لہجے کی کھنک بھی موجود ہو اور ترجمہ جس زبان میں کیا گیا ہو اس کے مزاج کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ کسی ترجمہ کی قدر و قیمت کو اسی صورت میں تسلیم کیا جا سکتا ہے جبکہ مفہوم و معنی کے ساتھ اس میں وہ آب و رنگ، وہ خوشبو اور وہ مزہ بھی منتقل ہو جائے جو اصل متن میں پایا جاتا ہو۔ بالفاظ دیگر ترجمہ پر گمان اصل تصنیف کا ہوتا ہو۔ اس میں کسی طرح کی بے نمکی نہ پائی جائے۔ اصل متن کے اسلوب اور اس کی زبان کی قوت کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنا (Without destroying all its sweatness) اہل قلم کی ذمہ داری ہے۔ یہ فقرہ توجہ کا طالب ہے!

The first requisite of an English Translation is that to be English.

یعنی ترجمہ انگریزی زبان میں کیا جا رہا ہے تو اس ترجمہ کا اولین تقاضا یہ ہوگا کہ وہ انگریزی ہو۔ محض انگریزی کے الفاظ جمع کر دینے کا نام انگریزی ترجمہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ الفاظ ہی نہیں، زبان کے مزاج اور اسلوب اور روزمرہ وغیرہ کے لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ وہ انگریزی ہو۔

کسی ادبی شہ پارے اور شعر و سخن کا ترجمہ نثر کے مقابلہ میں انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ ترجمہ میں ادبی محاسن، صوتی آہنگ اور نغمگی وغیرہ کو منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ قرآن کلام الٰہی ہے۔ اس میں جو ادبی محاسن، صوتی جمال، آہنگ، ردم (Rhythm) اور روانی (Flow) پائی جاتی ہے اور اس کے الفاظ اور فقروں میں معانی و معارف کی جو وسعتیں پائی جاتی ہیں، ترجمہ کی زبان میں ان سب کو منتقل کرنا انسان کے بس میں نہیں، پھر بھی کوشش اس بات کی ہونی چاہئے کہ قرآنی آیات کا ترجمہ سپاٹ اور بے جان نہ ہو۔ حتی الامکان قرآن کی اصل اسپرٹ اور زور بیان (Spirit and Fire) کو زندہ رکھنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ ترجمہ کی زبان میں جتنی بھی قوت ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حلاوت، بے ساختگی اور روح کو بیدار کرنے والی اس کی خصوصیات کو ترجمے میں بھی منتقل کرنے کی سعی لائق تحسین ہی نہیں ضروری بھی ہے۔

ہر زبان کی طرح عربی زبان کا بھی اپنا ایک مزاج اور اس کے اپنے اسالیب اور محاورے ہیں۔ ترجمہ میں اگر یہ چیز ملحوظ نہ رہے تو ترجمہ معائب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا قرآن کلام موثر کے ذیل میں آتا ہے۔ اس میں صوتی جمال کے ساتھ حسن معنی بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ پھر اس میں جو بے ساختگی، زور اور روانی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس لیے کوشش اس بات ہونی چاہیے کہ ترجمہ وقیع، رواں اور موثر ہو۔

قرآن کے ترجمے میں الفاظ قرآنی کے صحیح مفہوم و معنی کی تعیین ضروری ہے۔ اس کے علاوہ عربی زبان اور خاص طور سے قرآن کے اسالیب سے آشنا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس میں اگر تساہل سے کام لیا گیا تو ترجمہ اغلاط سے پاک نہیں ہو سکتا۔ عربوں کو قرآن کی جس چیز نے خاص طور سے مسحور کر دیا تھا وہ قرآن کا اسلوب (Pattern) اور آہنگ ہی تھا۔ اس کا مقابلہ کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ اس کے علاوہ قرآن میں جن ادبی صنعتوں کا استعمال ہوا ہے ان سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

ا۔ قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ وہ بسا اوقات کلام کا کچھ حصہ بیان کرتا ہے اور اس کا کچھ حصہ حذف کر دیتا ہے۔ اس طرح کلام طوالت سے محفوظ رہتا ہے اور الفاظ کم ہو جانے کی وجہ سے کلام زیادہ پر اثر ثابت ہوتا ہے۔ قرآن کتنے ہی ایسے حقائق، معانی اور معارف ہمارے سامنے پیش کرتا ہے الفاظ جن کے متحمل نہیں ہوتے۔ ایسے مواقع پر قرآن بالعموم حذف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ یہ وہ کنایہ ہے جو الفاظ سے بے نیاز ہوتا ہے۔

سلسلہ کلام میں کبھی قرآن درمیان میں اصل موضوع سے ہٹ کر موقع کی مناسبت سے کوئی ضروری بات بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر اصل کلام کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی موقع کی ضروری بات جو اصل موضوع سے ہٹ کر قرآن بیان کرتا ہے دراز بھی ہو جاتی ہے لیکن بالآخر کلام اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن میں غور وفکر کرتے ہوئے یا اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ایسے معترضہ جملوں سے باخبر رہنا بہت ضروری ہے۔ جہاں تک محذوفات کا تعلق ہے تو ترجمے میں یا تو ایسے مقامات پر نقطے لگا دیے جائیں یا پھر قوسین کے اندر محذوفات کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے تا کہ قاری کو قرآن کے سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ معترضہ جملوں کے آغاز اور آخر میں خط کھینچ کر ان کو اصل سلسلہ کلام سے الگ نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں جو بات کہی گئی ہے اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

قرآن میں ہے:

اَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّیْلَ لِیَسْکُنُوْا فِیْہِ وَالنَّھَارَ مُبْصِراً (النمل: ۸۶)

''کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے رات بنائی کہ وہ اس میں آرام وسکون حاصل کریں اور دن کو روشن بنایا''۔

قرآن نے یہاں حذف کے اسلوب سے کام لیا ہے۔ جو ذرا سے تامل سے کام لیں تو سمجھ میں آجاتا ہے۔ رات کے بارے میں بتایا کہ اسے لوگوں کے آرام وسکون کے لیے بنایا گیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ رات کیسی بنائی ہے۔ اسے حذف کر دیا۔ دن کے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ اس کے بنانے کا مقصد کیا ہے۔ اسے حذف کر دیا۔ البتہ یہ بتا دیا کہ اسے ہم نے روشن بنایا ہے۔ تقابل کے ذریعہ سے ہم بآسانی محذوف کو پُر (Fill Up) کر سکتے ہیں۔ جو محذوف ہے اسے پُر کرنے کے بعد قرآن کے اس فقرے کا مفہوم یہ ہوا:

''کیا انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو (تاریک) بنایا تا کہ وہ اس میں سکون وآرام حاصل کریں، اور دن کو روشن بنایا (کہ اس میں کام کریں)''۔

۲۔ جیسا کہ عرض کیا گیا سلسلہ کلام میں کبھی قرآن اصل موضوع سے ہٹ کر موقع کی مناسبت سے کوئی ضروری بات بیان نہیں کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر سلسلۂ کلام دوبارہ قائم ہو جاتا ہے۔ ایسے جملہ معترضہ کی یہاں صرف دو مثالیں دی جا رہی ہیں۔

سورۃ التطفیف میں ہے: کَلَّا اِنَّ کِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ. وَمَا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اَدْرٰاکَ مَاسِجِّیْنٌ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۔ یہاں کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ درحقیقت کِتَابُ الْفُجَّارِ کی صفت کے طور پر ارشاد ہوا ہے۔ درمیان میں وَمَا اَدْرٰاکَ مَاسِجِّیْنٌ جملہ معترضہ ہے۔ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ درحقیقت وَمَا اَدْرٰاکَ مَاسِجِّیْنٌ کا جواب نہیں ہے جیسا کہ بالعموم قرآن کے مترجمین نے سمجھا ہے۔ یہاں سجین کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ کتٰبِ مرقوم ہے، بلکہ کِتَابُ الْفُجَّارِ کے متعلق یہ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ وہ مرقوم یا مہر شدہ ہے۔ اسی طرح اس سورہ میں وَمَا اَدْرٰاکَ مَاعِلِّیُّوْنَ جملہ معترضہ ہے۔ یعنی درمیان میں موقع کی ایک بات فرمائی گئی ہے کہ تم عِلِّیُّوْنَ کی عظمت کو نہیں جان سکتے۔ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ کو عِلِّیُّوْنَ کی صفت قرار دینا صحیح نہیں ہے یہ غلط فہمی جملہ معترضہ کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

جملہ معترضہ کی دوسری مثال سورۃ الجمعہ میں دیکھیں۔ سورہ الجمعہ میں ابتداء رسول ﷺ کے فرائض بیان کرنے کے بعد یہود کی ذہنیت اور ان کے کردار کی گراوٹ کی عکاسی کی گئی ہے۔ اور یہ سلسلہ آیت ۸ تک چلا گیا ہے۔ درمیان میں آیت ۹-۱۰ جملہ معترضہ ہے۔ جس میں مومنین کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ یہود کے نقش قدم پر نہیں چلیں گے انھیں نہ دنیا پرست بننا ہے اور نہ ہی ان کو رہبانیت اختیار کرنی ہے۔ اس کے بعد پھر وہ سلسلہ جو یہود کے کردار کے متعلق چل رہا تھا اسے اس طرح پورا کیا گیا ہے: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْلَھْوَ نِ انْفَضُّوْا اِلَیْھَا وَتَرَکُوْکَ قَائِماً... الخ (آیت:۱۱) آیت ۱۱ کا تعلق درحقیقت آیت ۹-۱۰ سے نہیں بلکہ اس کا اصل ربط آیت آٹھ سے ہے۔

جملہ معترضہ کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے مترجمین نے سمجھا کہ یہ مومنین کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جب وہ تجارت یا کھیل تماشہ دیکھتے ہیں تو اس کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں اور رسول کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ یہود کا کردار تھا۔ نبی ﷺ جب یہود کو ان کی بستیوں میں جا کر خطاب کرتے تھے تو وہ بے دلی کے ساتھ آپ کی باتیں سنتے تھے۔ لیکن جیسے ہی انھیں کوئی بہانہ ہاتھ آتا بھاگ نکلتے اور نبی ﷺ کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ صحابہ کرامؓ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے رسول کو چھوڑ کر بھاگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائیں گے۔ وہ بھی کھیل تماشے تک کے لیے آپ کو تنہا چھوڑ دیں گے، رہے منافقین تو وہ تو اس لیے نہیں بھاگیں گے کہ انھیں اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ آپ کو چھوڑ کر بھاگیں گے نہیں۔ اس سلسلہ میں شانِ نزول سے متعلق جو روایتیں آئی ہیں ان میں ضعف اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ وہ قابل لحاظ ہرگز نہیں ہوسکتیں۔

۳۔ قرآن کے ادبی محاسن کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ اس میں بلاغت کے اصولوں اور صنائع کا جو استعمال ہوا ہے ان میں کچھ معروف اصول و صنائع بھی ہیں۔ مثلاً ایجاز و اطناب، مشاکلت، لف ونشر، توزیع، حذف، اور احتباک وغیرہ۔ قرآن کے ترجمہ کے وقت ان کی طرف توجہ رہنی چاہیے، قرآن کے مطالعہ میں کچھ نئے اصول واسالیب کا بھی سراغ ملتا ہے ان کو پیش نظر رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ مثال میں ہم یہاں صفت احتباک کو لیتے ہیں۔ اس صفت کی حسین تر مثالیں قرآن میں موجود ہیں، صفت احتباک یہ ہے کہ کلام میں دو مقابل کی چیزوں کا ذکر ان کے احوال کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ ایک کے لیے جس چیز کا ذکر کیا جائے دوسرے کے بیان میں اس کے مقابل کی چیز ترک کردیں۔ سورۃ الانشقاق میں ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ، فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا، وَیَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا، وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ، فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا. اِنَّهٗ کَانَ فِیْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا. (آیت:۷-۱۳)

”پھر جس کسی کو اس کی کتاب اس کے داہنے ہاتھ میں دی گئی تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ رہا وہ شخص جس کی کتاب اس کے پس پشت ڈال رکھی گئی تھی تو وہ ہلاکت (موت) کو پکارے گا اور دہکتی آگ میں جا پڑے گا - وہ اپنے لوگوں میں مگن تھا“۔

یہاں صفت احتباک کا استعمال ہوا ہے۔ ایک فریق کو اس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اس کو بیان فرمایا گیا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے فریق کو اس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑائیں گے یا سے لفظوں میں بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ تقابل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اصول کے تحت یہ خود عیاں ہورہا ہے۔ دوسرے فریق کے احوال کے بیان میں وراء ظهره فعل اوتی کا مفعول فیہ نہیں ہے بلکہ یہ کتاب کا حال ہے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ جو نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اسے دنیا کی زندگی میں اس نے پسِ پشت ڈال رکھا تھا۔ اسے اس کا مطلق احساس نہیں تھا کہ ایک دن اس کا سب کیا دھرا سامنے آکر رہے گا۔ تقابل سے یہ بات خود بخود عیاں ہورہی ہے کہ وہ لوگ جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے دنیا کی زندگی میں ہمیشہ اپنے نامۂ اعمال کو پیش نظر رکھا۔ اسے پس پشت ڈالنے کی غلطی انھوں نے نہیں کی۔ دوسرے اور کئی پہلو ہیں جو صفت احتباک کے ذریعہ سے ان آیات میں سامنے لائے گئے ہیں، طوالت کے خوف سے ہم ان کا ذکر نہیں کریں گے۔

صفت احتباک کی طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے بالعموم مترجمین قرآن ''وراء ظهره'' کا ترجمہ کرتے ہیں:

''جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا'' (مولانا مودودی)

''جس کا اعمال نامہ اس کے پیچھے سے پکڑا دیا جائے گا''۔ (مولانا امین احسن اصلاحی)

۴۔ قرآن کے متن میں ط، ج اور م وغیرہ کی شکل میں جو رموز واوقاف درج کیے گئے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ تلاوت کے وقت قاری صحیح مقام پر وقف کرے۔ ایسی جگہ سانس نہ توڑے جہاں سانس توڑنے سے معنی میں تبدیلی واقع ہوتی ہو۔ یہ رموز واوقاف صدر اول میں نہیں بلکہ بعد کے زمانہ میں درج کیے گئے ہیں۔ ان رموز پر ہر جگہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اصل بھروسہ تو قرآن کے متن پر ہونا چاہیے مثال کے طور پر سورہ فاطر میں آیا ہے:

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ. (آیت: ۱۸)

اس کا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی کرتے ہیں:

''تم تو بس انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے اپنے رب سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈرتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور جو پاکی حاصل کرتا ہے وہ اپنے لیے حاصل کرتا ہے۔ اور اللہ ہی طرف سب کی واپسی ہے"۔

اور مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ ہے:

"تم صرف انہی لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے"۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انما تنذر پر وقف ہونا چاہیے۔ یعنی آیت کا ایک فقرہ (Clause) یہاں تمام ہوتا ہے۔ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ سے دوسرا فقرہ (Clause) شروع ہوتا ہے۔ آیت کا ترجمہ ہوگا:

"تم تو بس خبردار کر رہے ہو، جو غیب میں رہتے ہوئے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز کے پابند ہو چکے ہیں (ان کا تزکیہ ہو گیا) اور جو اپنا تزکیہ کرتا ہے۔ وہ خود اپنے لیے ہی تزکیہ کرتا ہے۔ اور لوٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے"۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہنا سانس لینے کی طرح ایک مسلسل عمل ہے۔ نماز کا معاملہ اس سے تھوڑا مختلف ہے۔ نماز تو اظہار بندگی کی شکل میں عہد بندگی کی عملی تجدید ہے۔ نماز کا پابند ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو خدا کی بندگی کے حوالہ کر چکا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا ایک سنجیدہ اور انقلابی فیصلہ ہے جو وہ کر چکا ہے۔ لیکن خشیت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کوئی ماضی کی داستان نہیں ہے۔ بلکہ خشیت الٰہی تو مومنانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ہمہ آن مطلوب ہے۔ اسی لیے آیت میں اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ میں صیغہ ماضی کا استعمال ہوا ہے۔ اور يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ میں مضارع کا صیغہ لایا گیا ہے۔ ان بزرگوں نے اس فرق کا لحاظ نہیں رکھا۔ پھر الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کے بعد یہ محذوف ہے کہ انھوں نے اپنا تزکیہ کر لیا۔ جیسا کہ اگلے فقرہ (Clause) وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ سے صاف ظاہر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا مودودیؒ دونوں ہی بزرگوں نے تزکیہ کا مفہوم پاکیزگی لیا ہے۔ حالاں کہ تزکیہ کا اصل مفہوم بالیدگی، عمدگی، تکمیل (Perfection) ہوتا ہے۔ قرآن نے تزکیہ اور تطہیر میں فرق کیا ہے۔ قرآن میں ہے: ذٰلِکُمْ اَزْکٰی لَکُمْ وَاَطْهَرُ (البقرۃ: ۲۳۲) ''یہ تمہارے لیے زیادہ برکت وقوت اور پاکیزگی کا ذریعہ ہے''۔ ایک جگہ آیا ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا. (التوبۃ: ۱۰۳) ''تم ان کے مال میں سے صدقہ لے کر ان کو پاک کرو اور اس کے ذریعہ سے انھیں بالیدگی عطا کرو''۔ تزکیہ قرآن کے کلیدی الفاظ (Key Words) میں سے ہے، اس کی طرف سے تساہل صحیح نہیں ہوسکتا۔

۵۔ عربی روزمرّہ اور عربی محاوروں کی طرف توجہ نہ دینے سے بھی حیرت انگیز غلطیاں ہوتی ہیں۔ سورۃ الحج میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ''تو نے نہیں دیکھا اللہ نے اتارا آسمان سے پانی پھر صبح کو زمین ہوجاتی ہے سبز'' (آیت: ۶۳)۔ اسی طرح سورۃ المومنون میں آیا ہے: قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ. (آیت: ۴۰) اس کا ترجمہ شاہ صاحبؒ کرتے ہیں: ''فرمایا تھوڑے دنوں میں صبح کو رہ جائیں گے پچھتاتے''۔

دیکھیے روزمرہ کا خیال نہ رہنے کی وجہ سے ترجمے میں کیسی فاش غلطی ہوگئی۔

قرآن کے ان فقروں کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا:

> ''دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی ہے جو آسمان سے پانی برساتا ہے تو زمین اس سے سرسبز وشاداب ہوجاتی ہے''۔ (مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

دوسرے فقرے کا ترجمہ ہوگا:

> ''ارشاد ہوا، بہت جلد وہ پشیمان ہوکر رہیں گے''۔ (مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

اصبح اصل میں کان کے اَخوات میں سے بمعنی صار ہے۔

۶۔ اوپر ہم کہہ چکے ہیں کہ قرآن کے ترجمے میں الفاظ کی تحقیق نہایت ضروری ہے۔ قرآن میں ہے: وَمَا اَدْرٰىکَ مَا سَقَرُ لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ. (المدثر: ۲۷-۲۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ عبد القادر صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ''اور تو کیا بوجھا کیسی ہے وہ آگ؟ نہ باقی رکھے۔ نہ چھوڑے'' مولانا مودودی نے ترجمہ کیا ہے: ''اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے'' ابقیٰ علی فلان کے معنی ہیں: رحمه و اشفق علیه ۔ اسی معنی کے لحاظ سے یہاں تبقی کا استعمال ہوا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے آیت کا صحیح ترجمہ کیا ہے۔ ان کا ترجمہ ہے: اور کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے؟ نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی''۔ البتہ یہاں ایک سہو مولانا امین احسن صاحب سے ہوگیا ہے موصوف نے دوزخ کو مونث استعمال کیا ہے۔ حالاں کہ دوزخ مذکر ہے۔

۷۔ قرآن حکیم میں روز مرہ کی طرح محاورے (Idiom) کا بھی استعمال ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ محاورے کا اپنا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ کرنا صحیح نہ ہوگا۔ سورۃ الزخرف میں آیا ہے: اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحاً اِنْ كُنْتُمْ قوماً مُسْرِفِيْنَ ۔ (آیت: ۵) اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے: ''کیا ہم تمہاری تذکیر سے اس لیے صرف نظر کر لیں کہ تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو؟'' (مولانا امین احسن اصلاحیؒ) مولانا مودودیؒ ترجمہ کرتے ہیں: ''اب کیا ہم تم سے بیزار ہوکر یہ درس نصیحت تمہارے ہاں بھیجنا چھوڑ دیں اس لیے کہ تم حد سے گزرتے ہوئے لوگ ہو''۔

اس آیت میں ایک محاورہ ضرب عنہ الذکر صفحا کا استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کسی کو بالکل نظر انداز کر دینا۔ عربی شاعر نے اسی مفہوم میں اس محاورے کو استعمال کیا ہے:

اُدِيْمُ مَطَالَ الْجُوْعِ حَتّٰى اُمِيْتَهٗ وَاضْرِبْ عَنْهُ الذِّكْرَ صَفْحاً فَاذْهَلُ

اس آیت کا صحیح ترجمہ مارماڈیوک پکتھال کے یہاں ملتا ہے۔ پکتھال کا ترجمہ ہے:

Shall we Utterly ignore you because ye are a wanton folk?

''یعنی کیا ہم تمہیں اس لیے بالکل ہی نظر انداز کر دیں گے کہ تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو''۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۸۔ ترجمہ میں صرف ونحو یعنی گرامر کی طرف سے تساہل جائز نہیں ہے۔ تساہل خواہ کسی قسم کا ہو اس کی وجہ سے غلطی کا ہونا لازم ہے۔ اس کی ایک مثال لیجیے سورہ فاطر میں ہے:

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَ كُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ. (آیت: ۱۴)

مولانا امین احسن صاحبؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں:

''اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری فریاد نہیں سنیں گے اور اگر سنیں گے بھی تو تمہاری فریادرسی نہیں کریں گے''۔

قاعدہ ہے کہ لَو کے بعد شرط وجزا میں ماضی آجائے لَو مستقبل کے معنی لینا جائز نہیں۔ اس قاعدہ کی طرف سے تساہل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترجمہ غلط ہو گیا، صحیح ترجمہ ہوگا:

''اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سنیں گے نہیں۔ اور اگر وہ سنتے تو بھی تمہاری گزارش قبول نہیں کرتے''۔

۹۔ یہ ایک تسلیم شدہ بنیادی اصول ہے کہ قرآن کا بعض حصہ اس کے بعض حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ اور یہ کہ قرآن ہر قسم کے تضادات سے پاک ہے، لیکن قرآن کے اکثر مترجمین ترجمہ کرتے وقت اس قیمتی اصول کو بھول جاتے ہیں اس کی ایک مثال سورہ آل عمران کی ایک آیت ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آل عمران: ۱۰۴)

مولانا مودودیؒ صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''تم میں سے کچھ لوگ ایسے تو ضرور ہونے چاہیے جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔'' وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ ''میں ''من'' کو تبعیضیہ مان کر مولانا نے ترجمہ یہ کیا ہے۔ مولانا امین احسن صاحبؒ نے بھی اس آیت میں مــــن کو تبعیضیہ ہی مانا ہے۔ حالاں کہ من یہاں پر تبعیضیہ نہیں بیانیہ ہے۔ سورہ آل عمران کی آگے کی آیت ۱۱۰ خود یہ فیصلہ کر دیتی ہے۔ آیت ۱۱۰ یہ ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ دیکھیے یہ آیت فیصلہ کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہی ہے کہ پوری امت کی یہ منصبی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائیں اور انھیں منکر سے روکے۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۴ کا صحیح ترجمہ ہوگا: تمہارے پیکر میں ایک ایسی امت ظہور میں آنی چاہیے جو نیکی طرف دعوت دے اور بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے، یہی فلاح پانے والے ہیں"۔

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے بھی سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۰ کے پیش نظر اس کی آیت ۱۰۴ میں "مـن" کو پورے وثوق سے بیانیہ قرار دیا ہے اس سلسلہ میں مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہم اس پر اکتفاء کرتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ جس زبان میں کیا جائے اس زبان کے لحاظ سے بھی ترجمہ میں کوئی سقم نہیں ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ذرا سی بے توجہی سے ترجمے میں نقص پیدا ہوجاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ (الزخرف: ۵۴)

اس کا ترجمہ مولانا مودودیؒ صاحب کرتے ہیں: "اُس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی"۔ ترجمہ میں "انھوں نے" قوم کے لیے لائے ہیں، قوم اردو زبان میں واحد ہے۔ اور "انھوں نے" جمع کا صیغہ ہے۔ اسی لیے سورہ محمد میں ہے:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَ كُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ. (آیت: ۳۸)

اس کا ترجمہ مولانا موصوف نے کیا ہے: "اگر تم منھ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔ یہاں بھی ترجمہ میں زبان اردو کے لحاظ سے سقم پیدا ہوگیا ہے، قوم واحد ہے اور "وہ" "تم جیسے نہ ہوں گے"۔ جمع کا صیغہ ہے۔ مولانا امین احسن صاحب نے یہاں زبان کا لحاظ رکھا ہے۔ ان کا ترجمہ ہے:

> "اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے"۔

قرآن مجید کے اردو تراجم میں شاہ عبد القادر صاحبؒ کے ترجمہ کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اور یہ شہرت، مقبولیت بے وجہ نہیں ہے۔ شاہ صاحب کے ترجمہ کے مطالعہ سے ترجمہ کے بہت سے اصول معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لفظی یا تشریحی ترجمہ کے بجائے بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرة: ١٣٧) کا ترجمہ کرتے ہیں: اور وہی ہے سنتا جانتا''. وَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ (الحج: ٦١) کا ترجمہ کیا ہے: ''اور اللہ سنتا ہے دیکھتا''۔ قرآن کے ان فقروں کا ترجمہ بالعموم یہ کرتے ہیں: ''اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ اور اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے''۔ (مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

اردو زبان کے لحاظ سے شاہ صاحب کے ترجمہ کو ترجیح حاصل ہے۔ اس میں زور بھی ہے اور اس میں کسی طرح کا اشتباہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ''سننے والا، دیکھنے والا، جاننے والا'' کا یہ مفہوم بھی ہوتا ہے کہ وہ سننے اور جاننے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یعنی وہ مستقبل میں سنے دیکھے اور جانے گا۔ حالاں کہ قرآنی الفاظ کا مفہوم وہی ہے جو شاہ صاحب کے ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۳ میں الیہ تحشرون آیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''تم اس کے پاس جمع ہوگے''۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ''تم اسی کے حضور اکٹھے کیے جاؤ گے''۔ یہاں شاہ صاحب کا ترجمہ ہی انسب ہے۔ اصل مفہوم وہی ہے جو شاہ صاحب نے اختیار کیا ہے۔ اصل عربی متن میں مجہول کا صیغہ (Passive Voice) تو اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ عربی میں وہی فصیح ہے۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ کا ترجمہ ہماری زبان میں ہوگا: ''نہ وہ باپ ہے اور نہ بیٹا''۔ اگر لفظی ترجمہ کرتے ہیں کہ ''نہ جنا اور نہ جنا گیا''۔ تو ساری فصاحت جاتی رہے گی۔ عربی میں وہی فصیح ہے جو متن میں اختیار فرمایا گیا ہے۔ لیکن اردو زبان میں عربی کا انداز اختیار کرنے سے ترجمہ نہایت رکیک ہوکر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے اپنے بیان میں رکاکت سے پرہیز کیا ہے، یہ پرہیز ترجمہ میں بھی ضروری ہے۔

اردو تراجم میں زبان کے لحاظ سے مولانا مودودی علیہ الرحمہ کا ترجمہ لائق تحسین ہے، موصوف نے اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال قرآن کے ترجمہ اور اس کی تفسیر میں کیا ہے۔ انگریزی تراجم میں داؤد کا ترجمہ زبان کے لحاظ سے بہتر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض آیات کے سمجھنے میں مترجم نے غلطی کی ہے۔ انسان بہرحال انسان ہے۔ اس کی کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوشش کو آخری نہیں سمجھنا چاہیے۔ ونود پانڈے نے جو کیبنٹ سیکریٹری اور گورنر آف بہار رہے ہیں قرآن کا ترجمہ ہندی نظم معریٰ میں کیا ہے تاکہ ترجمہ میں ادبی شان کو باقی رکھا جاسکے۔ ونود صاحب ہندی کے کوئی بڑے شاعر نہ تھے۔ یہ ترجمہ اس سے بہتر اور زوردار ہوسکتا تھا۔ انھوں نے شائقین کو ایک نئی راہ ضرور دکھائی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ترجمہ کی تحریک انھیں داؤد کے انگریزی ترجمے سے ملی تھی۔ ونود صاحب چاہتے تھے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو صرف اس لیے نہ پڑھا جائے کہ احکام حاصل کیے جائیں بلکہ اس سے ادبی حظ بھی حاصل کیا جائے۔ جو شخص قرآن کے ادبی محاسن سے بے خبر رہا ہے اسے اس کے معنوی محاسن کی کیسے خبر ہوسکتی ہے۔

قرآن مجید کے تراجم کے سلسلہ میں جو چیز اصولی باتیں مثالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ وہ یہ اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں کہ قرآن کے ترجمے کا کام نہایت ذمہ داری کا ہے۔ اس کے لیے غیر معمولی صلاحیت اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مترجم حساس اور باذوق ہو اور ترجمے کے کام میں وہ کسی قسم کے تساہل کو روا نہ رکھے۔

☆

© rasailojaraid.com